"صبح کل آئے گی"

(تحریر: راشد شاز)

ہم جس دنیا میں سانس لے رہے ہیں وہ راتوں رات وجود میں نہیں آگئی ہے۔ ساتویں صدی عیسوی کے مدینۃ النبیؐ سے عالمی دار الحکومت کی دمشق منتقلی کے بعد بغداد، ایمسٹرڈم اور لندن کے بعد اب واشنگٹن ڈی سی کو دنیا کے دار الحکومت کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے جس سے آنکھیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ گو کہ اس وقت عالمی سطح پر دوسرے اقوام و ملل بھی قوت کے میزانئے میں اپنا کچھ نہ کچھ وزن رکھتے ہیں مثلاً روس اور چین کو نظر انداز کیا جانا ممکن نہیں اور نہ ہی فرانس، برطانیہ اور جرمنی کی اقتصادی قوت سے یکسر صرف نظری ممکن ہے۔ دوسری طرف ہندوستان جیسی ابھرتی معیشت بھی اپنی سبقت کے لیے جدوجہد میں مصروف ہے۔ ایک طرف یورولینڈ کے ارتقاء نے جہاں ڈالر کے مقابلے میں ایک متبادل معیشت کا بگل بجا دیا ہے تو دوسری طرف دنیا میں اس حقیقت کا بھی اعتراف ہوتا رہا ہے کہ اکیسویں صدی کی دنیا کو متحرک رکھنے کے لیے ایندھن کے جو ذخائر شہہ رگ کی حیثیت رکھتے ہیں ان کا ایک خاصہ بڑا حصہ عالم اسلام میں پایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایندھن کے پچاس فیصد ذخائر صرف پانچ ممالک میں موجود ہیں گویا آنے والے دنوں میں دنیا عالم اسلام سے بے نیاز ہو کر مستقبل کا منصوبہ تشکیل نہیں دے سکتی۔ بظاہر تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قوت کے جزیرے دنیا کے مختلف خطوں میں واقع ہیں لیکن عملاً واشنگٹن ڈی سی کا قوت کے ان تمام بکھرے جزیروں پر کنٹرول قائم ہو گیا ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد عالمی سطح پر جو اتھل پتھل ہوئی ہے اس نے اس حقیقت کو مزید منکشف کر دیا ہے کہ سیکورٹی کونسل کے دوسرے ممبران کی اہمیت کے باوجود دنیا میں عملاً فیصلہ کن حیثیت واشنگٹن ڈی سی کو حاصل ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے اعتراف کے بغیر صورت حال کی تبدیلی کے لیے اگر کوئی منصوبہ تشکیل دیا گیا تو اسے حقیقت پسندی سے اجتناب پر محمول کیا جائے گا۔

صورتِ حال کے اس اعتراف کے بعد اس حقیقت کا اعادہ بھی ضروری ہے کہ دنیا میں کوئی بھی صورتِ حال ایسی نہیں جس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی انسانی تاریخ میں کبھی کوئی قوت ناقابل تسخیر رہی ہے۔ ہاں ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم خوش فہمیوں سے بلند ہو کر جذباتی طرز فکر سے کنارہ کشی کرتے ہوئے ایک حقیقت پسند اسٹریٹیجی تشکیل دیں۔ افسوس کہ گیارہ ستمبر کے واقعہ کو کوئی

ساڑھے چار سال کا عرصہ گزرا، امت مسلمہ جو ان تمام ایام میں امریکی نشانے کی زد پر رہی ہے اب تک حقیقت حال کا اعتراف کرنے اور کسی عملی جدوجہد کا منصوبہ تشکیل دینے میں سہل پسندی سے کام لیتی رہی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ عراق میں امریکی مشن کا طول اور افغانستان میں کرزئی حکومت کی حدودِ کابل میں محصوری، فلسطین میں حماس کی کامیابی، پاکستان میں دینی جماعتوں کا سیاسی عروج اور خود امریکہ میں بش انتظامیہ کے مسلسل گرتے گراف نے امریکی استعمار کے لیے خاصی دشواریاں پیدا کر دی ہیں لیکن اس کے باوجود اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ امریکی استعمار کی اس جزوی ہزیمت سے عنقریب امریکہ کے زوال کا راستہ ہموار ہو گیا ہے یا یہ کہ واشنگٹن ڈی سی کا سقوط اب چند دنوں کی بات ہے تو ایسا سوچنا دراصل خوش فہمیوں کی دنیا میں جینا ہوگا۔ اس میں شبہ نہیں کہ ظلم جب حد سے بڑھ جائے تو کوئی بھی نظام زیادہ دنوں تک نہیں چل سکتا۔ لیکن امریکہ میں جس طرح بش حکومت کے خلاف آوازیں اٹھ رہی ہیں، عراق کے مسئلے پر حکمراں طائفے پر عوام کو گمراہ کرنے کا الزام لگ رہا ہے اور جس طرح خود امریکہ کے اندر اہل فکر سیاسی و سماجی کارکن اور انسانی حقوق کے چھوٹے بڑے ادارے حریت فکر و عمل کو برقرار رکھنے کے لیے میدان میں آرہے ہیں اس نے امریکی نظام کے اندر اصلاح کے امکانات کو برقرار رکھا ہے۔ امریکی جمہوریت کی یہی وہ قوت ہے جو ظلم و استحصال کی پالیسیوں کے باوجود اسے زندگی جینے کا مزید موقع فراہم کرتی رہی ہے اور اگر اس سلسلے پر بش کا طائفہ یکسر روک لگانے میں ناکام رہا تو فکر و نظر کی یہی آزادی واشنگٹن ڈی سی کو مزید عالمی دارالحکومت کی حیثیت سے برقرار رکھ سکے گی۔

سوویت یونین کے زوال کے بعد ریاست سے وابستہ بعض امریکی دانشوروں اور پالیسی سازوں نے اسلام کو ایک نئے خطرے کی حیثیت سے پیش کیا۔ ان کی اس ژولیدہ فکری کو مواد فراہم کرنے میں ان پرجوش دینی تنظیموں، انجمنوں نے اہم رول ادا کیا جو کبھی امریکی عزائم کے حلیف بن کر روس کے خلاف افغانستان میں سرگرم عمل تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ افغانستان کو سوویت یونین کے قبضے سے بچانا اور سرخ انقلاب کی توسیع پسندی کو لگام دینا اس وقت بیشتر مسلم ممالک بشمول پاکستان کی اپنی ضرورت تھی۔ تب امریکی امداد ان کے وقتی مقاصد سے ہم آہنگ تھی۔ البتہ سوویت یونین کے انخلاء کے بعد جہادی تنظیمیں اس حقیقت کو فراموش کر گئیں کہ سوویت یونین کی پسپائی میں ان کے زورِ بازو کے علاوہ دوسرے محرکات بھی کلیدی اہمیت کے حامل رہے ہیں۔ جہاد افغانستان کے دوران مافوق الفطری واقعات کا ہونا، شہداء کی لاشوں سے متعلق کشف و کرامات کے واقعات اور ان جیسی عوامی داستانوں نے ہمارے نوجوانوں کو ذہنی طور پر ایک ایسی دنیا میں پناہ لینے پر مجبور کیا جہاں حقیقت پسندی کے بجائے رومانس کا غلبہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو لوگ ایک مشترکہ حکومت کی تشکیل پر متفق نہ ہو سکے اور جن کی قبائلی عصبیت یا گروہی وابستگی اسلام

کے اجتماعی مفاد پر غالب رہی، وہ یہ خواب دیکھنے لگے کہ سوویت یونین کی اینٹ سے اینٹ بجائے کے بعد اب وہ دنیا کی واحد پاور امریکہ کا بھی وہی حشر کر سکتے ہیں۔ مسلم نوجوانوں کی اس رومان پسندی نے، جس میں حالات کے حقیقت پسندانہ تجزیے کے بجائے جوش و جذبہ کو کہیں زیادہ دخل تھا، پوری امت کو ایک ایسے راستے پر ڈال دیا جس کے سبب ہم بغیر کسی تیاری کے مغرب سے دو دو ہاتھ کرنے پر مجبور ہو گئے۔ جدید دنیا کی طرف اسلام پسندوں کے اس رومانوی رویے کے پیچھے بعض ایسی اساطیری داستانیں بھی سرگرم رہیں جن کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا لیکن جس نے ہمارے زوال کے عہد میں مسلم فکر میں اپنی جگہ بنا لی تھی۔ پندرہویں صدی ہجری کی ابتداء میں صدی کے پہلے دن جہیمان العتیبہ نے جب حرم مکی کا محاصرہ کیا تو وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ نئی صدی کا نیا سورج جس شخص کے ہاتھوں طلوع ہو گا اس کا تعلق اس مہدئ برحق کے طائفے سے ہے۔ یہ روایت کہ ہر صدی کے سرے پر خدا کوئی مجدد پیدا کرے گا فنی اعتبار سے بے اصل ہونے کے باوجود صدیوں سے ہماری راسخ العقیدہ فکر کا حصہ بنی رہی ہے۔ ایران میں خمینی کی قیادت میں صدیوں سے خوابیدہ شیعہ فکر کے احیاء نے بھی سنی مسلمانوں کے ذہن پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ دنیا بھر سے اسلام پسند تنظیمیں جو جہاد افغانستان کے حوالے سے پاکستان کے سرحدی شہروں میں جمع ہو گئی تھیں اب نفسیاتی طور پر اپنے کو فاتح تصور کرتیں اور اور نئی صدی میں اسلامی احیاء کے لیے کوئی ٹھوس اور حقیقت پسندانہ منصوبہ بندی کے بجائے اساطیری ماحول سے غذا حاصل کرتیں۔ طالبان کی حکمرانی کے بعد امیر المؤمنین جیسی اصطلاحوں کے استعمال سے اس رومانی لب و لہجہ کی تشکیل میں مزید مدد ملی۔ ایسا محسوس ہوا کہ گویا بیسویں صدی کے آخری عشرے میں انصار و مہاجرین کا گروہ ایک بار پھر باطل سے نبرد آزما ہونے کے لیے نئی صدی کے مدینہ، قندھار اور اس کے اطراف میں جمع ہو گیا ہے۔ نہ تو مسلم اہل فکر نے صحیح صورتِ حال کے ادراک کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی نئے مہاجرین و انصار کو اس حقیقت سے آگہی ہو سکی کہ وہ جس نظام کو شکست دینا چاہتے ہیں ان کے پاس اس کے لیے سرے سے مطلوبہ تیاری ہے ہی نہیں۔ طالبان رسومِ دین داری کو اسلام سمجھ بیٹھے تھے۔ وہ حلقۂ دیوبند کی جامد رسوم داری سے آگے سوچنے کی صلاحیت سے بے بہرہ تھے، خود اہل قبلہ کے دوسرے گروہوں کا ایمان ان کے لیے قابل اعتبار نہ تھا۔ cult-thinking کے حامل لوگ اگر اساطیری توہمات کا شکار ہو جائیں تو وہ اپنے غیر عقلی رویے سے کسی بڑے حادثے کو تو جنم دے سکتے ہیں البتہ کسی نئی دنیا کی داغ بیل نہیں ڈال سکتے۔

گیارہ ستمبر کے واقعہ کو کوئی سات سال ہونے کو آرہے ہیں اب تک امت مسلمہ عوامی سطح پر بار کوخبا سنڈروم سے باہر نہیں آسکی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب رومی گورنر کے ظلم و جبر سے تنگ آکر بار کوخبا نے مسلح بغاوت کا اعلان کیا تو اسے ہر خاص و عام یہودی کی

ہمدردی حاصل ہو گئی۔ حالات سخت تھے اور عوام اس سے نجات کے طالب بھی۔ بار کوخبا کی عسکری لیاقت اور اس کی سلیم الفکری پر تو شاید ہی کسی کو اعتبار تھا البتہ عوام تو عوام خواص بھی یہ سمجھتے تھے کہ رومیوں کو چیلنج دینے کا حوصلہ تو بہر حال اس میں ہے۔ ربائی اکیوا جسے اہل یہود کی مذہبی فکر میں بڑی اہمیت حاصل ہے انہوں نے بھی بار کوخبا کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ بار کوخبا کی عسکری تیاری اور اس کی فکری لیاقت کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے اس وقت کا مسیحا تسلیم کر لیا گیا اور پوری یہودی قوم اس کے پیچھے آ گئی۔ ایک لمحے کو ایسا محسوس ہوا گویا اہل یہود اپنا کھویا ہوا جاہ و حشم حاصل کرنے کی پوزیشن میں آ گئے ہوں۔ لیکن کہاں رومی حکومت کی منظّم طاقت اور کہاں اہل یہود کے بے ہنگم گروہ اور اس کی خالی خولی نعرہ بازیاں۔ بار کوخبا کی بغاوت اس طرح کچلی گئی کہ ایک طویل مدت تک کے لیے اہل یہود پر سخت مایوسی طاری ہو گئی۔ ابھی زیادہ دنوں کی بات نہیں جب فلسطین سے پشاور تک اور انڈونیشیا سے مراکش تک اسامہ بن لادن کی حمایت میں عوامی جوش و جذبہ کا یہ عالم تھا گویا پوری قوم ان کی قیادت میں متحد ہو گئی ہو۔ اساطیری ماحول حقیقت پسندی سے اجتناب کی راہ دکھاتے ہیں۔ یہ وقتی طور پر کسی بار کوخبا، کسی سباطائی زی وی، کسی جہیمان العتیبہ اور کسی بن لادن کو تو پیدا کر سکتے ہیں البتہ اساطیری جوش و جذبات پر ابھرنے والی تحریکوں سے انسانی تاریخ میں کبھی بھی کوئی نئی دنیا پیدا نہیں کی جا سکی ہے۔

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ بن لادن یا دوسرے جہادی گروہ موجودہ عالمی نظام کی جن ناانصافیوں کو نشانۂ تنقید بناتے ہیں یا صورتِ حال کی اصلاح کا جو داعیہ انہیں سرگرم رکھتا ہے انہیں عقلی یا مذہبی بنیادوں پر مسترد کیا جا سکتا ہے۔ البتہ وہ جس طرح دنیا کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں اس سے صاف لگتا ہے کہ انہیں جدید دنیا کی واقعی تفہیم حاصل نہیں ہے۔ نظری اعتبار سے بھی وہ اسلام کی ان جامد تعبیرات کے اسیر بن کر رہ گئے ہیں جسے استعماری عہد کی پیداوار کہا جا سکتا ہے جہاں ہمارے اہل فکر نے اسلام کو صرف مدافعت کی زبان میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

صبح کل آئے گی

مدینۃ النبیؐ سے واشنگٹن ڈی سی کے سفر تک کوئی چودہ صدیوں کا عرصہ گزرا ہے البتہ ضروری نہیں کہ اس پورے تاریخی سفر کی بساط لپیٹنے کے لیے بھی اتنی ہی مدت درکار ہو۔ اگر ہم ان عوامل کی نشاندہی میں کامیاب ہو گئے جس نے کل ساتویں صدی کے مدینہ کو

عالمی دارالحکومت میں تبدیل کر دیا تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ ایک بار پھر دنیا کے سیاہ و سفید کے فیصلے ان کے ہاتھوں میں آ جائیں جو نظری طور پر خود کو آخری رسولؐ کی امت سمجھتے ہیں۔ البتہ ان عوامل کی نشاندہی میں صرف مدینۃ النبیؐ کا زمانی و مکانی مطالعہ کافی نہ ہو گا کہ ایسا کرنا ہو سکتا ہے کہ ہمیں تاریخ پر غیر معمولی انحصار پر مجبور کرے بلکہ اس سے بھی کہیں آگے بڑھ کر وحی ربانی کی روشنی میں ہمیں ان عوامل کی نشاندہی کرنی ہو گی جسے قرآن نے سیادت پر مامور قوموں کا وصف بتایا ہے۔ پھر تکملہ کے طور پر اس بات کا جائزہ لینا بھی مناسب ہو گا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ آج اکیسویں صدی کی ابتداء میں بوجوہ واشنگٹن ڈی سی کو عالمی منظرنامے میں کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ گویا نئی دنیا کی تفہیم کے بغیر وحی ربانی کی حامل امت سیادت عالم کے فریضۂ منصبی کا کما حقہ حق ادا نہیں کر سکتی۔

نئے منصوبے پر کام کی ابتداء کے لیے ایک نئے مسلم ذہن کی تشکیل پہلا مرحلہ ہو گا۔ وحی ربانی کے از سر نو مطالعے سے ہمیں بعض ان معتقدات کو جو کثرت تکرار سے کلیشے بن گئے ہیں نئے فکری ڈھانچے میں نئی معنویت عطا کرنے میں مدد مل سکتی ہے۔ مختصراً میں چند نکات کی طرف اشارہ کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

1۔　قرآن مجید وحی ربانی کا آخری غیر محرف وثیقہ ہے۔ یہ ایک ایسی کتاب جس کی کوئی نظیر اس دنیا میں موجود نہیں۔ اس کا مطالبہ ہے کہ انسانی ذہن غور و فکر، تدبر و تفکر کے سلسلے کو جاری رکھے۔ گویا قرآن مجید کی مرکزی اور کلیدی اہمیت کو کسی تاریخی، تفسیری، تعبیری ادب کے تابع نہ کیا جائے۔

2۔　محمدؐ رسول اللہ کے متبعین ایک ایسی عالمگیر دعوت کے امین ہیں جس میں ابراہیم و اسمٰعیل، اسحٰق و یعقوب، موسیٰ و عیسیٰ اور تمام سچے انبیاء کی جدوجہد کا ارتکاز پایا جاتا ہے۔ اس عالمگیر دعوت کو دین محمدی پر محمول کرنا رسول اللہ کی عظمت کی سچی تعبیر نہیں ہو سکتی۔ رحمۃ للعالمین اور بشیراً و نذیرا کے متبعین کو چاہیے کہ وہ محض اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے بجائے پوری انسانیت کی دادرسی کا عملی مظاہرہ کریں۔ اس کے برعکس اگر متبعین محمدؐ صرف اپنے قومی افتخار کی بلندی یا امت محمدیہ کی فلاح و بہبود میں مصروف ہو گئے تو ایسا کرنا اس عظیم تر انسانی مشن سے انحراف ہو گا۔

3۔　قرآن مجید عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ ایک ایسے صاف ستھرے شفاف اسلوب کو اختیار کرنے کا سیدھا مطلب یہ ہے کہ ترسیل کی سطح پر یہاں کسی ابہام کی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ اس لیے محض زبان اور ثقافت کی وجہ سے ایک عالمی کتاب پر اہل

عرب کی اجارہ داری کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا۔ مختصراً یہ کہ اسلام کی صحرائی اٹھان کے باوجود عرب ثقافت اس کا جزوِ لاینفک نہیں ہے جسے آسمانی پیغام کی طرح تقدس حاصل ہو۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم کی صدائے عام اس بات سے عبارت ہے کہ مستقبل کا اسلامی معاشرہ عرب و عجم، سیاہ و سفید، نسب و رنگ کے امتیازات سے بالاتر ہو گا۔ نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہو گی اور نہ ہی کسی خاص ثقافت کو اسلام کا اصل الاصل قالب گردانا جائے گا۔

4۔ آخری وحی کے حاملین کی حیثیت سے مستقبل کی انسانی تاریخ میں متبعین محمد کی کلیدی اہمیت مسلم ہے البتہ نوع انسانی کی قیادت کا یہ کام مسلمان تن تنہا انجام دے سکتے اور نہ ہی وہ اس کے لیے مکلّف ہیں۔ ایک عالمی نظام کی تشکیل میں کلمۃ سواء کی بنیاد پر دوسری اہل ایمان قوموں کو شرکت کی دعوت ہمارے مقاصد کے حصول کو آسان کر دے گی۔ ماضی میں اسی وسعتِ قلبی نے ہمیں ناقابل تسخیر phenomenon میں تبدیل کر دیا تھا۔

5۔ دین اسلام کی یہ تعبیر کہ اہل حق کے دوسرے طائفوں پر نجات کے دروازے بند ہیں اور یہ کہ اس قسم کی بشارت پر مشتمل قرآنی آیات منسوخ یا مؤول ہیں ایسی انسانی تعبیریں ہیں جنہیں حتمی صداقت کے طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ کلمۃ سواء کی بنیاد پر اہل حق کے طائفوں کو مجتمع کرنے میں یہ تعبیریں جو اپنا خاص ثقافتی اور سماجی پس منظر رکھتی ہیں مسلسل مزاحم ہوتی رہی ہیں۔ عالمی نظام انصاف کی قیادت کے لیے مسلمانوں کو از سر نو اسی وسیع القلبی کا مظاہرہ کرنا ہو گا جس کا قرآن داعی ہے۔

6۔ بعض ثقافتی تاریخی اور سیاسی عوامل کے سبب مسلم معاشرے میں عورت کے سماجی رول کی نفی کی جاتی رہی ہے۔ احکام حجاب کو ثقافت کا تابع کر دینے کی وجہ سے مسلم معاشرے کی آدھی قوت صدیوں سے کالعدم ہے۔ مختلف زمانوں میں فقہائے اسلام نے عورت کے دائرۂ کار کے تعین اور حجاب سے متعلق جو رہنما خطوط تشکیل دیئے ہیں اسے وحی کی لازوال تعبیر کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا کہ بسا اوقات یہ تعبیریں عہد رسولؐ کی مدنی زندگی سے متصادم نظر آتی ہیں۔ عالمی سطح پر ایک پاکیزہ اسلامی معاشرے کا قیام عورتوں کو ان کے قرآنی حقوق لوٹائے بغیر ممکن نہ ہو گا۔

7۔ قرآن مجید رہتی دنیا تک کے لیے کتاب ہدایت ہے۔ قرآن مجید کا یہ دعویٰ کہ وہ کتاب مفصل ہے، کسی لمبی چوڑی تشریح و تعبیر کے امکان کی نفی کرتا ہے۔ خدا جو قادر مطلق ہے وہ یقیناً بندوں کے مقابلے میں اظہار پر کہیں زیادہ قادر ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ فہم قرآن میں تفسیری اور تعبیری ادب کو کلیدی اہمیت کا حامل سمجھا جائے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ شانِ نزول کی غیر معتبر

روایتوں میں وحی کے معانی کو مقید کرنے کے بجائے قرآن مجید کو عصرِ حاضر کی وحی کے طور پر پڑھا جائے۔ بیان للناس کا قرآنی دعویٰ ہم سے مطالبہ کرتا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اسے کتاب ہدایت کی حیثیت سے پڑھنے اور برتنے کا حوصلہ پیدا کرے۔ ایسا کرنا قرآن کی بنیاد پر ایک ہمہ گیر عوامی تحریک کو جنم دینے کا موجب ہو گا۔

8۔　اسلام جس نظامِ عدل، اخوت اور مساوات کا علم بردار ہے اس کی عملی تعبیر ایک ایسی فضا میں ہی ہو سکتی ہے جہاں انسان اور خدا کے مابین کوئی انسانی ادارہ یا کسی مذہبی پیشوائی کو کوئی دخل نہ ہو۔ علم اور اہل علم کی اہمیت اپنی جگہ مسلم۔ اہل مسلم سے اکتساب تو کیا جا سکتا ہے البتہ انہیں religious authority کی حیثیت نہیں دی جا سکتی۔ قرآن جس حریت فکر کا داعی ہے اور رسول کو (ويضع عنهم إصرهم والأغلال التي كانت) کے جس فریضۂ منصبی پر مامور بتایا گیا ہے، اس کا تقاضہ ہے کہ مسلم ذہن مشائخ پرستی سے آزاد ہو کر لوجہ اللہ ایک نئی ابتداء کا اہتمام کرے۔ عین ممکن ہے کہ نئی ابتداء کے اہتمام میں متبعین محمدؐ سے بعض فکری اور عملی لغزشوں کا صدور بھی ہو۔ انسانوں سے ایسی توقع غیر فطری نہیں۔ لیکن قرآن مجید کا بار بار تفکر اور تعقل پر اصرار ہم سے اس بات کا طالب ہے کہ ہم سلفِ صالحین کی فہم کو حرفِ آخر سمجھنے اور ان کی تعبیری غلطیوں کو اپنے کندھوں پر ڈھونے کے بجائے اپنی غلطیوں کی طرح ڈالیں۔ سلفِ صالحین جن کی لغزشوں کو بوجوہ تقدس کا مقام حاصل ہو گیا ہے اس کے مقابلے میں عصرِ حاضر کے انسانوں کی لغزشوں کا محاکمہ اور ان کی اصلاح کا کام نسبتاً آسان ہو گا۔

یہ وہ چند بنیادی نکات ہیں جن کے سرسری تذکرے سے یہ بتانا مقصود ہے کہ دنیا کی صورتِ حال میں ایک انقلابی تبدیلی کے لیے نئے مسلم ذہن کی تشکیل کو کلیدی اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف بھی ہونا چاہیے کہ نئے ذہن کی تشکیل کے لیے تیرہ صدیوں پر مشتمل تعبیری ادب میں بنا بنایا فکری سرمایہ خاصہ کم ہے۔ روایتی طرزِ فکر جو قرآن کے بجائے اساطیری ماحول سے غذا حاصل کرتی ہے نسلاً بعد نسل ایک مصنف سے دوسرے مصنف کی کتابوں میں نقل ہوتے رہنے کے سبب راسخ العقیدہ فکر کا ترجمان بن گئی ہے۔ ایسی صورت میں قرآن مجید کو اصل الاصل تناظر میں پڑھنے کی دعوت ایک ہمہ گیر علمی تحریک برپا کئے بغیر مؤثر نہ ہو سکے گی۔ ماضی میں بعض اصحاب نے روایتی ذہن پر ضرب لگانے کے لیے جو فکری کوششیں کی ہیں انہیں امت میں قبول عام نہ مل سکا۔ ایسی تحریریں تفردات قرار دے کر لائبریریوں کی زینت بنا دی گئیں۔ عصرِ حاضر کے شارحین کے لیے لازم ہو گا کہ وہ علمی تفردات میں اضافے کے بجائے قرآن مجید کو عملی رہنمائی کا مرکز بنائیں۔ خالص علمی مباحث اور تفردات کی نکتہ آفرینی کے

بجائے قرآن مجید کو ایک ایسی عام فہم کتاب کے طور پر پڑھنے کی کوشش کی جائے جو متبعین محمدؐ کی قیادت میں تمام انسانیت کو مژدۂ جانفزا سناتی ہو۔

ایک نئے قرآنی تصورِ حیات کی تشکیل جس کی بنیاد پر کوئی غلغلہ انگیز عالمگیر تحریک اٹھائی جاسکتی ہو گہرے اور سنجیدہ غور و فکر کے ساتھ ہی ہمہ جہت منصوبہ بندی کی بھی طالب ہے۔ لازم ہے کہ ہمارے بہترین دماغ، جنہیں بیک وقت جدید دنیا کی تفہیم بھی حاصل ہو اور جو قرآن مجید اور اسوۂ رسولؐ کی کلیدی اہمیت سے آشنا ہوں، اپنی بہترین صلاحیتیں اس مقصد کے لیے صرف کر دیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس سلسلے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے اس نے عرب و عجم اور مشرق و مغرب میں خاصے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔ مختلف زبانوں کے کوئی تین چار سو اعلیٰ دماغ اہل قلم بھی ہمارے رابطے میں آئے ہیں جو ایک نئی ابتداء کی ضرورت کا شدید احساس رکھتے ہیں۔ گزشتہ سات آٹھ برسوں کی قلمی اور فکری کاوشوں کے بعد شاید اب وقت آگیا ہے کہ ایک عالمگیر منصوبے اور غلغلہ انگیز علمی تحریک کے لیے مشترکہ جدوجہد کا ڈول ڈالا جائے۔ ماضی میں بعض احباب کی طرف سے گاہے بہ گاہے اس خیال کا اظہار بھی ہوتا رہا ہے کہ نئے مسلم ذہن کی تشکیل کے لیے ایک ایسی دانش گاہ کا قیام بنیادی اہمیت کا حامل ہے جہاں قرآنی دائرۂ فکر میں جدید دنیا کے لیے اصحاب فن پیدا کئے جاسکیں۔ یہ فی نفسہ اتنا بڑا کام ہے کہ اس کے بطن سے عالم اسلام کے لیے ایک نئی صبح طلوع ہو سکتی ہے۔ البتہ کسی ایسی دانش گاہ کے قیام سے پہلے ہمیں ماضی کے ان تجربات کو بھی اپنی نگاہوں میں مستحضر رکھنا ہو گا کہ آخر کیا وجہ تھی کہ علی گڑھ اور دیوبند کے امتزاج کی جو کوشش ندوۃ العلماء کے قیام کا سبب بنی، وہ کسی نئی ابتداء کے بجائے پرانے طرزِ فکر کا توسیعہ بن کر رہ گئی اور شبلی نعمانی کو بالآخر پسپائی اختیار کرنا پڑی۔

گزشتہ دنوں طالبان کے افغانستان پر امریکی فضائی حملوں کے درمیان بار بار یہ خیال کچوکے لگاتا رہا کہ جب تک ہماری دانش گاہیں B-52 بمبار طیارے کا جواب فراہم نہیں کرتیں، مغرب کے مقابلے میں ہزیمت اور پسپائی ہمارا مقدر رہے گی۔ ایک ایسی دنیا میں جہاں علوم و فنون پر مغرب کو واضح برتری حاصل ہے وہاں ایک امکانی رویہ اگر یہ ہو سکتا ہے کہ ہم علوم و فنون اور سائنسی ایجادات و اختراعات میں مغرب سے آگے نکلنے کی کوشش کریں تو وہیں ایک دوسرا ممکنہ عملی رویہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علوم و فنون کی حامل قوموں کو اسلام کے عالمگیر مشن کے لیے مسخر کیا جائے۔ اسلام کی آفاقی دعوت کا اصل جوہر تو یہی ہے کہ وہ اپنے سخت ترین دشمنوں کے لئے بھی مژدۂ جانفزا بن جاتا ہے۔ عہد رسولؐ میں آفاقی اسلام کی اس دعوت نے مختلف قوموں اور ان کے اعلیٰ اصحاب

علم و فن کو اسلام کی خدمت پر مامور کر دیا تھا۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ آج مغرب کے پالیسی ساز اداروں اور مفکرین کو اسلام کی آفاقی دعوت اپنی اصل الاصل قالب میں متوجہ نہ کر سکے۔ 1258ء میں سقوط بغداد کے بعد ایسا محسوس ہوتا تھا گویا اسلام اور مسلمانوں پر اب کبھی صبح نہ آئے گی۔ لیکن وہی لوگ جو عباسی بغداد کی تاراجی کا سبب بنے تھے آنے والی صدیوں میں اسلام کے محافظ و نقیب بن گئے۔ عجب نہیں کہ ایک آفاقی اور پیمبرانہ لب ولہجہ کی تشکیل مغرب کے ایوانوں کو بھی اسی صورت حال سے دوچار کر دے۔

اتنے بڑے چیلنج کے مقابلے کے لیے عالمی معیار کی ایک یونیورسٹی کا قیام اس منصوبہ کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہو سکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم سنجیدہ غور و فکر کے بعد خود اعتمادی اور خدا اعتمادی کے ساتھ آگے قدم بڑھائیں۔